



”تو پھر آپ نے خود کو بدلا کیوں نہیں اب

تک؟“

”بس بہت ہو گئی، جاؤ جا کر اپنی کلاس لو۔ میرا دماغ زیادہ مت کھایا کرو۔“

وہ دانت نکالتے ہوئے اٹھا اور بغیر کچھ کہے چل دیا۔ وہ دونوں شہر کے ایک پرائیویٹ اسکول میں دسویں کلاس کے پیچھے تھے اور دونوں ہی صبح کے وقت گراؤنڈ میں پڑے کسی ایک بیچ پر بیٹھ کر بے تکی سوال جواب کیا کرتے تھے۔ وہ جس کا نام ماں نے سکھی رکھا تھا، اس اسکول میں گزشتہ پانچ سال سے کام کر رہی تھی جبکہ حماد علی اس کا جونیئر تھا۔ چار سال چھوٹا جونیئر اس کی تعیناتی کو ابھی صرف ایک سال ہوا تھا۔

یہ اس سے اگلے دن کی بات ہے۔

”آج لیٹ ہو گئے؟“

”ہاں جی، دس منٹ لیٹ۔ آپ نے کل

والے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”کون سا سوال؟“

”بھول بھی گئیں۔“

”ہاں بھول گئی۔ کوئی اور سوال کرو۔ بلکہ چھوڑو،

مجھے بتاؤ، ہم روز یہاں کیوں وقت ضائع کرتے ہو؟“

”بس یونہی اچھا لگتا ہے۔“

”کیا اچھا لگتا ہے؟“

”آپ سے بات کرنا۔ آپ اپنا نمبر نہیں

دیتیں۔ کسی ایرے غیرے سے زیادہ بات نہیں کرتیں۔“

”آپ بہت اچھی ہیں۔“

”شکریہ۔“

”آپ کو خوشی نہیں ہوئی سن کے؟“

”میری عمر کیا ہے؟“

”تیس سال..... کیوں؟“

”تو جب آپ کی عمر تیس سال ہو اور آپ اپنے

بارے میں کافی حد تک جانتے ہوں تو تعریف یا تنقید

آپ کے لیے کیا معنی رکھتی ہے۔ آپ اپنی

خصوصیات کو پہلے ہی جان چکے ہوتے ہیں۔“

”یعنی آپ پہلے ہی جانتی ہیں کہ آپ بہت

اچھی ہیں۔“

”ہاں بالکل، اور تمہیں پتا ہے، اچھا ہونے کی

سب سے بری بات کیا ہوتی ہے؟“

”اچھا ہونے میں کیا برائی ہو سکتی ہے؟ خیر آپ

خود ہی بتادیں۔“

”لوگ اچھے لوگوں سے ایک فٹ کی دوری پر

رہتے ہیں۔ برائی خطرناک ہوتی ہے لیکن زیادہ

اچھائی اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ لوگ

اپنے بارے میں تحفظات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس

لیے زیادہ اچھے لوگوں سے دور رہتے ہیں۔“

”تو کیا لوگ آپ سے ہمیشہ دور رہتے ہیں؟“

”ہاں ہمیشہ دور..... بہت دور نہیں لیکن بہت

نزدیک بھی نہیں۔“

”آپ کو دکھ ہے اس بات کا؟“

”تو کیا نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی آپ کو چھوڑ کر

چلا جائے اور وجہ بھی آپ کی اپنی اچھائی ہو تو کیا خوشی

ہوتی ہے؟ مجھے تو نہیں ہوتی۔“

”تو تم نے یہ طریقہ نکالا کہ میرے ذاتی وقت میں میرا سر کھانے لگے۔“
 ”معذرت..... لیکن دو باتیں آپ سے سیکھ لوں گا تو شاید آگے آسانی ہو جائے گی۔“
 ”میں تمہیں کہاں سے عالم لگتی ہوں۔ دماغ چل گیا ہے کیا۔“

”اچھا چھوڑیں۔ یہ بتادیں، آپ کا نام آپ کی امی نے نکھی کیوں رکھا تھا؟“
 ”ہاں، یہ میں ضرور بتا سکتی ہوں۔ ہوا کچھ یوں کہ امی کو اردو زبان سے محبت ہو گئی۔ انہوں نے سارا کا سارا اردو ادب پڑھ ڈالا اور پھر جب میں پیدا ہوئی تو ان کی خواہش تھی کہ نام ہو تو اردو زبان میں ہو۔ بس پھر تجاویز کا ڈھیر لگ گیا اور امی کے دل کو نکھی بھا گیا۔“

”تو پھر آپ اس قدر دکھی کیوں رہتی ہیں؟“

”میں دکھی نہیں رہتی۔ کبھی خوش ہوتی ہوں، کبھی اداس۔ یہ تو سب کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ میری رائے چیزوں کے حوالے سے قنوطی ہوتی ہے۔ یہ میں مانتی ہوں اور حالات کو میں زیادہ تر منفی رخ پر دیکھنے کی عادی ہوں۔ میں یہ بھی مانتی ہوں۔“

”حالانکہ عملاً آپ کافی مثبت انسان ہیں لیکن آپ کی شخصیت کا یہ رخ..... ہاں ہر انسان میں کوئی نہ کوئی برائی ہوتی تو ہے۔ مجھے ایک اور بات بھی محسوس ہوتی ہے، غلط ہو تو بتائیے گا۔ آپ بذات خود ایک مثبت انسان ہیں لیکن جو آپ کے ارد گرد کے لوگوں نے آپ کو کچرا دیا ہے، وہ سب آپ کی شخصیت کو ایک منفی رخ دے گیا ہے۔“

”کچرا.....؟ مجھے پسند آئی ہے تمہاری بات لیکن اس بات کو مان لینا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ ایسے جیسے لوگوں پر ڈال دو اور خود بری ہو جاؤ۔ میرے خیال میں ہمیں اپنی اچھائی کے ساتھ ساتھ اپنی برائی کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔ اگر لوگوں نے کچرا دیا تھا تو میں نے خود کو کوڑے دان سمجھ کر سب کچھ جمع ہی کیوں

کر لیا۔ انکار کرنا چاہیے تھا، روکنا چاہیے تھا۔“
 ”تو پھر اب؟“

”اب کیا..... بس اب یہی ہے کہ یا تو اس سب کے ساتھ رہا جائے یا پھر یہ سب کسی اور کو تحفتاً دان کر دیا جائے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ کوئی اور حل بھی تو ہو سکتا ہے۔ مثلاً.....؟“

”مثلاً آہستہ آہستہ اسے اپنی اچھائی سے ڈی کمپوز کر دیا جائے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر لمبی سانس بھرتے ہوئے سامنے کی طرف دیکھنے لگے۔ کیوں کہ بات کہنا آسان ہوتا ہے جبکہ اس پر عمل کرنا مشکل۔ اپنی اپنی کلاس کی طرف جانے سے پہلے پندرہ منٹ وہ بغیر کوئی بات کیے وہیں بیٹھے رہے تھے۔ چپ، خاموش، اپنی اپنی سوچوں میں کم۔

”پھر وہ کام بے معنی ہے جس کا کوئی جواب نہ ہو۔“ وہ جواب دے کر دائیں مڑ گئی تھیں۔ ان کی کلاس آگئی تھی۔

وہ پھر سے سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگی تھی۔ ارد گرد کے شور پر ایک اور شور غالب آ گیا تھا۔ سوالات کا شور، لوگوں کی نگاہوں کا شور۔

☆☆☆

یہ اس سے اگلی صبح کی بات تھی۔ وہ دونوں کافی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ اتنی خاموشی اب اسے چبھنے لگی تھی۔ اس تکلیف وہ خاموشی کو توڑنے میں اس نے پہل کی تھی۔

”مجھے ایک بات کرنی تھی۔“ اسے اپنے ہی لہجے کی جھجک اداس کر گئی تھی۔

”میں نہ، ابھی آپ کو کچھ بتانا تھا۔“ اس کے انداز سے غیر معمولی پن جھلکا تھا۔

”ٹھیک ہے، پہلے تم بات کر لو۔“ اسے ویسے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات کرے۔

”میری سعودیہ میں ایک فرم میں جاب لگ گئی ہے۔ میں نے کل ہی اپنا استعفیٰ اسکول میں جمع کروایا ہے۔“ وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوا تھا۔

”بہت بہت مبارک ہو۔ پھر آج آخری دن ہے تمہارا؟“ اس نے بغیر پلکیں جھپکے کہا تھا۔

”ہاں جی، آخری دن ہے۔ آپ..... آپ کوئی بات کر رہی تھیں؟“

”نہیں، میں کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ واپسی کب ہوگی؟“

”نامعلوم۔“ ایک لفظی جواب آیا تھا۔

گھنٹی بج چکی تھی۔ جانے والا رخت سرفراں تھا۔

چکا تھا۔ اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ اٹھ کر چل دیا تھا۔ وہ وہیں بیچ پر تنہا بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس کے گرد اندھیرا سا پھیل گیا تھا۔ مٹری نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جالا بنا تھا۔ اس جالے کے ہر تار پر اس کا ماضی رقم تھا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اندھیروں میں ڈوبتی گئی تھی اور ماضی کے منظر واضح ہوتے گئے تھے۔

☆☆☆

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کوریڈور میں کچھ سوچتے ہوئے چل رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں بورڈ مارکرز پکڑے ہوئے تھے جبکہ دوسرے ہاتھ میں رجسٹر اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کے ارد گرد سے بچے بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔ بریک ٹائم ختم ہونے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ اچانک ہی کوئی اس کے ہم قدم ہوا تو اس نے چونک کر دیکھا۔

”ارے مس فائقہ! آپ.....“ اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

”جی میں سبھی! سنہ آپ تو چونک ہی گئیں۔ کن خیالوں میں تھیں سرکار۔“ انہوں نے شرارتی انداز میں کہا تھا۔

”کولنگ ہونے کے ناتے دونوں میں اچھی علیک سلیک تھی۔ اکثر مذاق چلتا تھا دونوں کا اور اسکول کی ساری نئی خبروں کا ذریعہ بھی تھیں مس فائقہ! وہ اچھے مزاج کی خوش اخلاق ٹیچر تھیں۔“

”نہیں نہیں چونکنا کیسا..... آپ بھی کلاس کی طرف جارہی ہیں؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

”ہاں جی، کلاس کی طرف ہی جارہی ہوں۔ ایک بات ہے۔ سوچ رہی ہوں، کروں یا نہ کروں۔“

انہوں نے تھوڑا جھجک کر کہا تھا۔

”کر دیں۔“ انہیں یہی جواب چاہیے، اسے پتا تھا۔

”سرمہاد اچھے لگتے ہیں آپ کو؟“ انداز نہ سوال پوچھنے جیسا تھا نہ ہی اطلاع دینے جیسا۔ بالکل بے معنی انداز تھا۔

”تو کیا سوال بھی اٹھنے لگے ہیں۔“ اس نے بغیر رکے پوچھا تھا۔

”سوال تو اٹھتے ہی ہیں۔ انسان کے پاس جواب ہونا چاہیے۔“ مس فائقہ یک دم مدبر بنی تھیں۔

”جواب نہ دینا چاہے انسان یا پھر جواب ہو ہی نہ تو.....“ اس نے قدرے دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔

کردینا چاہیے کیونکہ جانے والوں کو روکا نہیں جاسکتا۔“

”اس سے کیا ہوگا ابا؟“
”آپ گڈ بائے کر کے تو دیکھو۔ آپ کو آگے بڑھنے میں آسانی ہو جائے گی۔“

اس نے بھی اگلے ہی دن اس نصیحت پر عمل کر ڈالا تھا لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ اب زندگی میں اسے نہ جانے کتنی ہی بار لوگوں کو گڈ بائے کرنا پڑے گا۔

ابا دنیا سے گئے تو بھیا نے بھی اپنی دنیا ان سے الگ کر لی۔ بھیا اپنی بیوی بچوں سمیت اوپر والے پورشن میں شفٹ ہو گئے اور نچلے پورشن میں وہ، اماں اور خاموشی بسنے لگے۔

مکڑی کا جالا سمٹتا گیا اور ماضی پر حال غالب آ گیا۔ اس نے اپنی تیس سالہ زندگی میں نہ جانے کتنے ہی لوگوں کو خود سے دور جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اب کتنی بھولنے لگی تھی۔ اتنا تو اسے پتا ہی تھا کہ جانے والوں کو رخصت کیا جاتا ہے، صدا نہیں دی جاتی۔

☆☆☆

”سر حماد چلے گئے؟“ مس فائقہ نے بیٹھے بیٹھے اچانک اس سے مخاطب ہو کے کہا تھا۔
اس نے کاپیاں چیک کرتے ہوئے اطمینان سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

مس فائقہ نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو بھی اسے دیکھتی ہی چلی گئیں۔

”کیا ہو گیا بھئی۔“ اس نے جھنجھلا کر ان کو دیکھا تھا، پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اچھی بات ہے، اب لوگوں کی باتیں خود ہی دم توڑ جائیں گی۔“
”پھر حماد کی دو بہنیں ہیں جن کی شادی ان کے ذمہ ہے۔ اور گھر کا سارا بار بھی ان پر ہے۔ ظاہری بات ہے وہ اپنی اچھی آفر کیسے ٹھکرا سکتے تھے۔“ مس فائقہ نے ٹاپک چھیڑنے کی شرمندگی میں سر حماد کی طرف سے صفائی ہی دے ڈالی تھی۔

وہ تیس سال کی تھی جب اس کی منگنی اس کے خالہ زاد سعد سے ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ سے اپنا نام سعد کے ساتھ ہی سنا تھا۔ چنانچہ وہ لمحات اس کے لیے باعث خوشی و تسکین تھے لیکن پھر اس منگنی پر وقت کی گرد پڑتی گئی۔ چار سال گزر گئے۔

سعد امریکہ گیا تو واپسی کا راستہ ہی بھول گیا۔ انتظار کی ان گھڑیوں سے اکتا کر اس نے منگنی کی انگوٹھی اتار کر رکھ دی۔ اس سے اگلے سال بالآخر سعد کا فون آیا تھا۔ اس نے کانٹے ہاتھوں سے فون کان سے لگایا اور اگلے نے بغیر ہتھکے دو جملوں میں بغیر معذرت کیے سارے رشتے توڑ دیے تھے۔

اس کے دل کی بستی اجڑ گئی تھی لیکن آخر کرب تک وہ اپنے دکھ کو لے کر بیٹھی رہتی۔ اس نے امی ابو کی تسلی کے لیے خود کو سمیٹ لیا تھا۔ امی ابو نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کی تک دو شروع کر دی تھی لیکن ستائیس سال کی لڑکی کے لیے ایک اچھا رشتہ ڈھونڈنا بہت مشکل ثابت ہوا تھا اور ان ہی سب مسائل میں جکڑے ہوئے اس کے ابا کے دل نے ایک دن دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ جس دن اس کے ابا اسے چھوڑ کے گئے، اسے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا تھا۔

وہ تقریباً آٹھ سال کی تھی۔ اس کی سب سے اچھی دوست تھی سارا۔ جب یہ سارا کے نئے دوست بنے تھے، وہ اسے بھول گئی تھی۔ اس کا ننھا سا دل دوست کی بے اعتنائی پر دکھی ہو کر رہ گیا تھا۔ اس دن بھی وہ اسکول سے واپس آ کر صوفے پر اداس بیٹھی تھی، جب ابا نے اس سے پوچھا تھا۔

”کیا ہوا، میری مانو بلی کو؟“
”ابا! میری دوست نے نئی دوستیں بنالی ہیں۔“
”تو آپ بھی اور دوستیں بنالو۔“
”لیکن مجھے صرف سارا پسند ہے۔“

”ضروری تو نہیں جو آپ کو پسند ہو، وہی آپ کے ساتھ بھی رہے۔ اگر وہ آپ کے ساتھ دوستی نہیں رکھنا چاہتی تو آپ کو بھی اسے اچھے سے گڈ بائے

اسے یہ سب پہلے سے ہی پتا تھا چنانچہ اس نے صرف شانے اچکانے پر اکتفا کیا تھا۔

☆☆☆

دن رات میں ڈھل رہا تھا اور دن صبح میں۔ کب خزاں آئی تھی، کب بہار، معلوم ہی نہیں پڑتا تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔ بس وہ وہیں ٹھہر گئی تھی۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی کا پیاں چیک کر رہی تھی جب مس فائقہ اس کے ساتھ آ کر بیٹھی تھیں اور تھوڑے وقف کے بعد بولی تھیں۔

”سر حماد یاد ہیں؟“ ان کی عادت نہیں گئی تھی۔ تمہید باندھے بغیر بات کرنے کی۔ ان کے مطابق وہ صرف اس سے ایسے بات کرتی تھیں، اس کے سامنے انہیں تمہید باندھنا پسند نہیں تھا۔

”آپ مجھے تم کیوں کہہ کر بلاتی ہیں؟ میں تو آپ کو آپ کہتا ہوں۔“ آواز یاد بن کر اس کی یادداشت کے پردوں پر لہرائی تھی۔ اس نے ہلکے سے سر جھٹکا اور بغیر سر اٹھائے پوچھا تھا۔

”کون؟“

”سر حماد کی بات کر رہی ہوں۔“ انہوں نے قدرے فسوس سے اسے دیکھا۔

”ہاں تو پھر؟“ آخر اسے متوجہ ہونا ہی پڑا تھا۔ ”سر حماد واپس آ گئے ہیں۔ تین سال گزرتے پتا ہی نہیں چلا۔“ وہ بات کرتے کرتے ہی وہاں سے چل دی تھیں۔ وہ انہیں جانا دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

مس فائقہ کی خبر کے کچھ دن بعد کی بات تھی۔ وہ سکون سے صبح کے وقت بیچ پر بیٹھی تھی، جب کوئی اس کے ساتھ آ کر بیٹھا تھا۔ اسے بغیر دیکھے بھی پتا چل گیا تھا کہ جانے والا لوٹ کر آ گیا تھا۔ اسے اپنا آپ سرد ہوتا محسوس ہوا تھا۔

اس کا دل چاہا تھا۔ کہے۔ ”ٹھہری ہوئی بالکل ساکن زندگی کے کھیل میں اسے برف کر دیا گیا تھا اور سب اسے اپنی کرنا بھول گئے تھے۔ وہ برف بنی اپنی بے بسی پر کرائی لوگوں کو آگے بڑھتا دیکھتی رہ جاتی

تھی۔

”میں نے سوچا، اپنے پرانے کولیکڑ سے مل آؤں۔“ اس کی طرف سے جواب نہ پا کر وہ دوبارہ بولا تھا۔

وہ کیوں واپس آیا تھا؟ اس نے دل میں سوچا۔ اسے لگا تھا، وہ بولے گی تو پھٹ جائے گی۔ اس لیے اس نے خاموشی میں پناہ لی تھی۔

”ناراض ہیں؟ کوئی بات نہیں کریں گی مجھ سے؟“ اس نے تھوڑا سا اس کی طرف مڑ کر بات کی تھی۔

وہ یونہی سامنے کی طرف دیکھتی خاموش اور ساکت بیٹھی رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، آپ مت کریں بات مجھ سے لیکن میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ سن لیں۔ میں چاہتا ہوں، آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے امی سے بات کی ہے، وہ آپ کے گھر آنا چاہتی ہیں۔ آپ جو بھی جواب دیں گی، وہ میرے لیے قابل احترام ہوگا۔ آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ آپ کا جواب اور آپ دونوں میرے لیے بہت معنی رکھتے ہیں۔ آپ جب چاہیں اس نمبر پر کال کر کے مجھے اپنا جواب بتا سکتی ہیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

اس نے جیسے ایک پرچی نکال کر ان دونوں کے درمیان رکھی تھی۔

صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہ سب پہلے سے ہی سوچ کر آیا تھا۔ اسے معلوم تھا، وہ سنجیدہ ہے۔ جب اس نے اسے اپنے گھر کے حالات بتائے تھے، تب بھی وہ ایسے ہی سنجیدہ تھا۔ نے تلے انداز میں اپنی بات سناتا ہوا جیسے نہ جانے کتنے دنوں سے لائیں ترتیب دے رہا تھا۔

وہ جھٹکے سے اٹھی اور پرچی کے چار ٹکڑے کر کے سیدھا چلتی گئی تھی۔ اتنا رد عمل تو وہ بھی توقع کر رہا تھا۔ اس لیے سب سے ملنے کے بعد اپنا نمبر مس فائقہ کو دے گیا تھا۔

☆☆☆

”ہیلو! سو تو نہیں رہے تھے؟ مجھے جواب دینے سے پہلے کچھ پوچھنا تھا۔“ اس نے اس سے پہلے کبھی اس سے فون پر بات نہیں کی تھی۔ اس لیے تیزی سے ساری بات بولتی چلی گئی۔

”جی جی..... نہیں نہیں..... میں جاگ رہا تھا۔ کیا پوچھنا تھا آپ کو؟“ اس کے انداز سے بوکھلاہٹ واضح تھی۔

”تم جاتے وقت مجھے انتظار کا نہیں کہہ کر گئے تھے، تو پھر اب اچانک واپسی؟“ اسے عجیب لگا یہ پوچھنا۔ حجاب سے اس کے ہاتھ پسینے سے بھرے جا رہے تھے۔

”میں نہیں چاہتا تھا، آپ انتظار کریں۔ میری چند ذمہ داریاں تھیں اس وقت۔ میں آپ کو اس سب میں اپنے ساتھ نہیں کھینچنا چاہتا تھا۔ اگر آپ زندگی میں آگے بڑھ جاتیں تو میرے لیے آپ کی خوشی مقدم ہوتی۔ لیکن پھر بھی معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے سکون سے اپنی بات پوری کی تھی۔

”تم آنٹی کو بھیج سکتے ہو۔“ اس نے ہمت جمع کر کے بات کی تھی۔ ”میرا جواب ہاں ہے۔“

”آپ نے پورے تین ماہ لگا دیے اتنا آسان جواب ڈھونڈنے میں۔“ اس کے لہجے سے شرارت اور خوشی بیک وقت جھلکے تھے۔

”ہاں، تین سال کی مسافت بھی تو طے کی ہے۔ تین ماہ کیا معنی رکھتے ہیں۔“ مکان بھری مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔

”بالکل ٹھیک بات کہی ہے آپ نے۔“ وہ باادب ہوا تھا۔

فون بند ہوا تو اس کے دل کی خوشی اس کے لبوں سے شکر کے کلمات بن کر نکلی تھی۔ سوالات کے جوابات بل چکے تھے۔ کھوئی ہوئی چیزیں اپنے ٹھکانے لگ چکی تھیں۔ مسافر واپس لوٹ آئے تھے۔ دنیا نے نئے رنگ اوڑھ لیے تھے اور اس کے چہرے پر آسودگی نے اپنے ڈیرے جما لیے تھے۔

☆

کبھی کبھی انسان پر ایسا وقت بھی آتا ہے، جب سارے جواب کھو جاتے ہیں اور پیچھے بچ جاتے ہیں صرف سوال۔ وہ بھی اپنے سوالوں کی ریت میں دھنستی جا رہی تھی۔ وہ جب گیا تھا تو کوئی سرا تو اس کے ہاتھ نہیں دے کر گیا تھا۔ پھر اس اچانک واپسی کا کیا مطلب تھا؟ وہ کون ہوتا تھا اس کی ٹھہری ہوئی زندگی میں ہلچل مچانے والا؟ اور سب سے بڑھ کر وہ کیا جواب دے؟ اسے لگا تھا سوالوں کی اس بازگشت نے اس کی سننے کی صلاحیت چھین لی ہے۔ وہ..... وہ جواب نہیں سن پار ہی تھی جو اس کا دل اسے دے رہا تھا۔ اس رات بھی وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو باہر صوفے پر آ بیٹھی تھی۔ بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا، جب اس کے ساتھ ابا آ کر بیٹھے تھے۔

”کیا ہوا میری مانو ملی کو؟“ کیسا سکون ملا تھا اسے ابا کی آواز سن کر۔

”ابا! جواب نہیں مل رہا۔ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ لوٹ کے آنے والے کے ساتھ کیا ہے؟“ وہ کہتے کہتے روہانسی ہو گئی تھی۔

”میری بیٹی کو نئے جواب ڈھونڈنے پڑ رہے ہیں۔ یہ تو اچھی بات ہے۔“ ان کی مسکراہٹ ہر مسکراہٹ پر سبقت لے گئی تھی۔ ان کے وجود سے پھوٹی روشنی کو وہ مبہوت ہو کر دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہ صبح وہیں کاؤچ سے اٹھی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر وہیں بیٹھ کر اپنے جوابات جمع کیے تھے۔ اب وہ فریش ہو کر اپنے لیے کافی بنا رہی تھی۔ جب اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چینی کے ڈبے کو شیلف پر رکھا تھا اور رات کے خواب کو دھیان سے سوچا تھا۔

”نئے جواب؟“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ آج سے پہلے کوئی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ کوئی بھی نہیں۔ یہ پہلی دفعہ تھا، یہی وجہ تھی جو وہ اس قدر ابھرنے کا شکار ہوئی تھی۔ کہرا چھٹتا گیا تھا، سورج کی پہلی کرن نے کھڑکی سے جھانک کر اسے مسکرا کر دیکھا تھا، جواب اپنا فون ڈھونڈ رہی تھی۔

☆☆☆